حافظ محمد عرفان الحق اظہار حقانی
مدرس دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

حضرت مولانا سمیع الحق اور ڈاکٹر مولانا شیر علی شاہ کا سفر ایران

امام مسلمؒ کے دیس خراسان (ایران) میں چند روز

(قسط۔۳)

درود آبشار کے دلکش خوشگوار اور حسین منظر ماحول نے شیخین (مولانا سمیع الحق اور مولانا شیر علی شاہ) کو دوپہر کے کھانے سے قبل ہی قیلولے پر آمادہ کیا۔ ادھر وہ لیٹے اور ادھر نیند کی وادیوں میں پہنچ چکے تھے۔

گھوڑ سواری:

میں (عرفان الحق) نے اور صاحب حسین نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور آبشار کے پیچھے پہاڑی کی سیر کیلئے نکلے۔ ابھی ہم تھوڑا ہی آگے گئے ہوں گے کہ وہاں اجرت پر گھڑ سواری کے لیے کئی گھوڑ بان نظر آئے۔ ایک گھوڑ بان میری طرف آیا اور پوچھا کہ کیا آپ گھوڑ سواری کرینگے؟ مولانا فاضلی صاحب کا بیٹا محمد یوسف میرے ہمراہ تھا اس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہاں یہ مہمان سواری کرینگے۔ مولانا فاضلی کے بیٹے یوسف نے مجھے کہا کہ اس طرح آپ کی گھوڑ سواری بھی ہوگی اور اس پہاڑی اور وادی کی سیر بھی ہو جائیگی۔ میں نے حامی بھر لی یہ تقریباً پونے بارہ بجے دوپہر کا وقت تھا جب میں ایک سفید گھوڑے پر سوار ہوا اور میرا دوسرا ساتھی بھی دوسرے گھوڑے پر سوار ہوا۔ سوار ہوتے ہوئے میں نے گھوڑ بان سے کہا کہ تھوڑی احتیاط سے چلیں اسلیے کہ میں اس سے قبل گھوڑ سواری سے نا آشنا تھا۔ لیکن گھوڑ بان نے مجھے لگام تھماتے ہوئے بتایا کہ اسے مضبوطی سے پکڑو اگر روکنا ہو تو پیچھے کی طرف کس لینا۔ اگر دائیں چلنا ہو تو دایاں لگام اور بائیں چلنا ہو تو بایاں لگام ایک طرف پیچھے کھینچ لینا۔ اللہ اللہ کر کے ڈرتے ہوئے میں نے اس کی ہدایات کے مطابق گھوڑا روانہ کیا۔ پہاڑی راستہ باریک، دشوار گزار اور کافی خراب تھا۔ راہ میں چھوٹے بڑے پتھر بار بار گھوڑے کی پھسلن کا سبب بن رہے تھے۔ اسلئے میں نے گھوڑ بان کو بلا کر کہا کہ آپ گھوڑے سے آگے آگے چلتے جایئے گھوڑ بان نے کہا کہ ''شما جوان استی چرا می ترسی'' یعنی تم جوان ہو کیوں ڈرتے ہو؟ تقریباً آدھا گھنٹے تک ہم اس پہاڑ کے سخت دشوار گزار اور پتھریلے راستے پر خوف وڈر کے عالم میں چڑتے رہے۔

واذا نظرت الی الجبال رایتها فوق السهول عواسلا وقواضباً

یہ پہاڑی سلسلہ بینالود زیادہ تر خشک تھا آخر ہم پہاڑ سے وادی کی طرف اترے جہاں بائیں طرف پیدل

چلنے والوں کے لئے کچا راستہ بنا ہوا تھا۔ میں نے مولانا فاضلی کے بیٹے سے کہا کہ اگر میں پہاڑی پر گھوڑے سے گرتا تو بچنا مشکل تھا اور شہید ایران کہلاتا۔

بہر حال اس طرح ہمیں سنت گھوڑ سواری کا موقع بھی مل گیا اور ایک قسم کی جہادی ٹریننگ و سیر و تفریح بھی ہوئی۔ ساڑھے بارہ بجے ہم واپس اپنی نشست گاہ جو ایک گھنے اور سایہ دار درخت کے نیچے تھی پہنچے۔ شیخین تا حال محو خواب تھے۔ ہماری باتوں اور جوتوں کی آہٹ نے ان کو بیدار کر دیا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ نے نیند کے مزے اڑائے اور ہم گھوڑ سواری سے لطف اندوز ہوئے۔

دوپہر کا لذیذ اور پُر لطف کھانا:

اس دوران ہمارے باورچی نے فاضلی صاحب سے آکر کہا کہ کھانا تیار ہو چکا ہے دستر خوان بچھائی جائے۔ ہم سب کی بھوک بھی اب کھانے کی متقاضی تھی۔ دستر خوان پر سب سے پہلے ہمارے سامنے ایران کے روایتی سلاد، قسما قسم مشروبات، لسی، دہی اور چاول رکھے گئے ایرانی چاولوں میں کسی قسم کا مرچ مصالحہ استعمال نہیں کیا جاتا گویا ہمارے لیے وہ چاول جوشے ہوئے پھیکے چاول تھے۔ لیکن ایرانی اسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کے بعد سیخوں میں بھنے ہوئے مرغ اور گوشت طشتریوں میں بجھائی ہوئی ہمارے سامنے لائی گئی۔ ایرانی روایات کے مطابق سیخوں میں سالم بھنے ہوئے ٹماٹر بھی رکھے گئے تھے۔ ہم نے کھانے کی ابتداء گوشت سے کی، گوشت کے بھنے ہوئے بڑے بڑے ٹکڑے کافی نرم، خوش ذائقہ اور مزیدار تھے۔ میں نے فاضلی صاحب سے پوچھا کہ یہ بھنا ہوا گوشت اس تھوڑے سے وقت میں اتنا نرم کیسے ہوا؟ تو انہوں نے نرمی کا راز بتاتے ہوئے کہا کہ اس گوشت کو رات بھر دہی اور لہسن میں رکھ چھوڑا گیا تھا اس لئے یہ اتنا نرم ہوا۔ گوشت کے بعد ہم مرغ سے لطف اندوز ہوئے۔ گویا آج جنگل میں منگل کا سماں تھا اور ہمیں من وسلویٰ مل رہا تھا۔

منعم بہ کوہ ودشت وبیاباں غریب نیست　　جائے کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

اگر چہ ہم منعم تو نہیں درویش تھے تاہم میری ناقص رائے اور تجربہ یہ ہے کہ علماء کھانے پینے اور لباس کے معاملے میں خوش بخت وخود کفیل ہوتے ہیں۔

کھانوں کی لذت، عمدگی اور میزبان کے خلوص کا اندازہ اس بات سے ہوا کہ ہم سب ساتھیوں نے بلا مبالغہ دو دو تین تین بندوں کے برابر کھایا۔ دستر خوان پر اگلا دور فروٹ اور میوہ جات کا چلا اس کے بعد تیسرا اور آخری دور چائے اور قہوے کا چلا۔ بعد میں ہم سب نے آبشار سے وضوء بنایا آبشار کا پانی صاف ستھرا، ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ مولانا سمیع الحق مدظلہ کی امامت میں ظہر کی نماز ادا کی گئی۔

شعر وشاعری: اس دوران پکنک منانے والوں کے قافلے آجا رہے تھے۔ آبشار کے اردگرد نہایت گہما گہمی کا عالم تھا۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ سیر و تفریح کے معاملے میں ایرانی نہ صرف زندہ دل بلکہ نہایت سخی اور فیاض بھی ہیں۔

اور وبدء بمن تعول پر عمل پیرا ہیں۔

نماز کے بعد درخت کے سایہ میں شعر وشاعری اور علمی لطائف وغرائب کا دور چلا۔ افسوس اس وقت میرے ساتھ کاغذ قلم دستیاب نہ تھے ورنہ تو کئی صفحات ان اشعار سے بھر جاتے جو پے در پے ایک دوسرے کے جواب میں مولانا سمیع الحق اور مولانا شیر علی شاہ نے کہے۔ ناچیز نے بھی تھوڑی بہت خامہ فرسائی کی۔ قارئین کے ذوق کے لئے اس مجلس کے چند اشعار جو ذہن میں یاد پڑتے ہیں پیش ہیں۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

احب الصالحین ولست منھم　　لعل اللہ یرزقنی صلاحاً

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا　　کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

حب النبی رسول اللہ مفترض　　وحب اصحابہ نورٌ ببرھانٖ　　من کان یعلم ان اللہ خالقہ　　فلایرمیین ابابکر ببھتانٖ

ولاابا حفص ن الفاروق صاحبہ　　ولاالخلیفۃ عثمان ابن عفانٖ　　واماعلی فمشھور فضائلہ　　والبیت لایستوی الاہارکانٖ

جاء ت بدعوتہ الاشجار ساجدۃ　　تمشی الیہ علی ساق بلاقدم

جزاک اللہ چشم ماباز کردی　　مرا بجان جاناں ہمراز کردی

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب　　گبرو ترسا وظیفہ خورداری　　دوستاں را کجا کنی محروم　　تو کہ بادشمناں نظر داری

حسن الحضارۃ مجلوب بتطریۃ　　وفی البداوۃ حسن غیر مجلوب　　این المعیز من لارام ناظرۃ　　وغیر ناظرۃ فی الحسن والطیب

فبائما قدم سعیت الی العلی　　ادم الھلال لاخمص القدمیہ

یالیھا المجد یُ علیہ روحہ　　اذ لیس یاتیہ لہ استجد آء

احمد عفا تک لاتجعت بفقدھم　　فلترک مالم یأ خذ واعطاوٗ

بلغ العلیٰ بکمالہٖ　　کشف الدجیٰ بجمالہٖ　　حسنت جمیع خصالہٖ　　صلوا علیہ وآلہٖ

روئے خوش بوئے خوش سبوئے خوش

ثلاثۃ یذھبن عن القلب حزن　　الماء والخضر و والوجہ الحسن

مرا در منزل لیلیٰ چہ امن وعیش چوں ہر دم　　لکن جرس فریاد مے دارد کہ بر بندید محملھا

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست　　در باغ لالہ روید و در شور بوم خس

نہ من تنہا دریں مے خانہ مستم　　جنید وشبلی وعطار ہم مست

فیا سکنی اکناف طیبۃ کلکم　　الی القلب من وجہ الحبیب حبیب　　اذا لم تطب فی طیبۃ عند مطیب　　بھا طیبۃ طابت فاین تطیب

اذا لم یجب فی ارض ربنا الدعا　　ففی ای ارض الدعا یجیب

گزرے تھے اسی راہ سے سرکار دو عالم　　ابھی تک مہ وانجم کی فضاء جھوم رہی ہے

یہ کوئے محبت ہے مدینہ کی گلی ہے دنیا بھی یہی ہے میری عقبیٰ بھی یہی ہے

اس مجلس کے دوران تاجکستان سے آئے ہوئے مہمان عالم دین مولانا حسن جان لکھتے رہے ارادہ تھا کہ ان سے کچھ لکھ لوں گا لیکن عرفت ربی بفسخ العزائم.

چہل قدمی اور وزارت خارجہ کے نمائندہ کی آمد:

مجلس کے اختتام پر مولانا سمیع الحق نے مولانا شیر علی شاہ کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ اس پر فضاء مقام پر تھوڑی بہت چہل قدمی بھی ہونی چاہئے ناچیز بھی ان کے ہمراہ ہوا تقریباً ایک فرلانگ تک چہل قدمی کرتے ہوئے وادی کے نشیبی راستے پر درود شہر کی طرف ہم چلتے رہے آگے وادی کے ایک کنارے اونچے مقام پر بچوں کے کھیل کھود کیلئے ایک چھوٹا پارک تعمیر کیا گیا تھا اسی پارک کے بنچوں پر ہم بیٹھ گئے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سامنے سے دو آدمی جو تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھے ہماری طرف بڑھ رہے تھے مولانا سمیع الحق صاحب نے فرمایا کہ شاید یہ لوگ ہمیں جانتے ہیں اور ہمیں ملنے آرہے ہیں اس گفتگو کے دوران وہ ہم تک پہنچ چکے تھے۔انہوں نے ہمارے ساتھ معانقہ ومصافحہ کیا اور پھر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ان میں سے ایک نے اپنا تعارف کرتے ہوئے بتایا کہ مجھے احمدی کہتے ہیں اور میں تہران سے خصوصی طور پر آپ کی خدمت کے لئے وزارت خارجہ کی طرف سے متعین کر کے بھیجا گیا ہوں۔ مجھے کل پہنچنا تھا لیکن جہاز لیٹ ہو گیا اس لئے بروقت نہ پہنچ سکا۔اب تہران سے مشہد ائیر پورٹ پر اتر کر سیدھا آپ کے پاس آرہا ہوں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ہمیں پہچانا کیسے، اور آپ کو کس نے بتایا کہ ہم یہاں بیٹھے ہیں؟ اس لیے کہ ہمارے ساتھیوں کو بھی علم نہیں کہ ہم کس طرف نکل آئے ہیں۔احمدی نے جواباً کہا کہ میں نے گاڑی میں گزرتے ہوئے آپ کو پاکستانی لباس میں دیکھ کر پہچان لیا اس نے بات بڑھاتے ہوئے مولانا سمیع الحق سے کہا کہ میں کوئٹہ کے ایرانی قونصلیٹ میں دو برس تک رہ چکا ہوں۔لیکن آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔اس کے بعد اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپکے ساتھ اس سے قبل ملاقات ہوئی ہے لیکن یاد نہیں پڑتا کہ کہاں ہوئی ہے۔میں نے ان سے کہا کہ مجھے تو کبھی کوئٹہ جانے کا اتفاق نہیں ہوا البتہ یہ ممکن ہے کہ کہیں اسلام آباد یا پشاور میں ملاقات ہوئی ہو۔کچھ دیر بعد ہم ان مہمانوں کو لیکر واپس اپنی نشست گاہ چلے آئے جہاں مولانا فاضلی صاحب ان کے منتظر تھے۔شاید ان کا آپس میں پہلے سے رابطہ ہوا تھا۔ان کے سامنے کھانا رکھا گیا۔مولانا سمیع الحق اور میں اس دوران پہاڑ کے دامن میں گلاس (میوہ) کے باغات کی طرف نکل گئے۔

ایک نوجوان کی اخلاص ومحبت:

یہاں بعض شخصی باغات مقفل تھے۔ایک باغ کے اندر ریسٹورنٹ بھی بنایا گیا تھا جہاں پکنک منانے والے لکڑی کے بڑے بڑے بنچوں اور تختوں پر بیٹھ کر کھا پی رہے تھے۔ہم تھوڑا آگے بڑھے تو دیکھا کہ دو چھوٹے ننھے بچے کھیل رہے تھے میں نے ان سے پیار کرتے ہوئے پوچھا کہ ''از کجا استی' خانہ شما کدام جا است'' تو ان بچوں نے سامنے

ایک گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم یہیں رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ایک نوجوان آیا اور نہایت محبت واخلاص کیساتھ مصافحہ کرتے ہوئے ہمیں بیٹھنے کا کہا لیکن ہم نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ابھی ہمیں واپس جانا ہے' مولانا سمیع الحق نے کچھ دیر اس نوجوان سے پاکستان اور ایران کے بارے میں گفتگو کی۔ اس نوجوان نے بتایا کہ یہ دو بچے میرے ہیں۔ ایک کا نام سجاد اور دوسری کا نام زہرای ہے' یہ باغ اور ریسٹورنٹ اس نوجوان نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ اسکے بعد ہم نے اس نوجوان سے اجازت لی۔ ادھر ہمارا قافلہ کوچ کرنے کیلئے تیار تھا سامان وغیرہ اکٹھا کیا جارہا تھا اس دوران اس باغ کے مالک نوجوان نے ہماری تواضع کیلئے گلاس (میوہ) کا گرم مشروب (یعنی چائے) پیش کیا ہم سب حاضرین نے اس نوجوان کی اخلاص ومحبت کی بناء پر اس ترش جوس کو پیا۔ مولانا سمیع الحق نے اس نوجوان کے بچوں کیلئے نقدی بھی ہدیہ میں دی۔ 3:30 بجے ہم یہاں سے نکل کر روانہ ہوئے

قدمگاہ: درود سے نکل کر ہماری اگلی منزل نیشاپور تھی تاہم راستہ میں ایک مقام پر روڈ کے اوپر بازار سے گزر ہوا تو میں نے فاضلی صاحب سے پوچھا کہ اس علاقے کا نام کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ قدمگاہ ہے۔ یہ شہر نیشاپور سے سولہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں ہر طرف سرسبز کھیتیاں اور باغات نظر آرہے تھے۔ میں نے ان سے اس کی وجہ تسمیہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ یہاں وہ پتھر ہے جس پر امام رضا کے قدمین کے نشانات ہیں۔ میرے دل میں قدمگاہ کی حقیقت دیکھنے کی جستجو پیدا ہوئی اس لیے شیخین سے عرض کیا کہ کیوں نہ خود جا کر اس پتھر کو دیکھا جائے جس پر قدمین کے نشانات امام رضا کی طرف منسوب ہیں۔ فاضلی صاحب نے کہا کہ وہ جگہ شہر سے ایک سائیڈ پر ہے اور پھر ہمیں آگے جانے میں دیر ہو جائے گی ہم نے کہا کہ چند منٹوں ہی کو تو بات ہے ان شاء اللہ اتنی دیر نہیں ہوگی شیخین نے بھی میری رائے کی تائید کی اور اب ہماری گاڑی شہر کے دائیں طرف اس روڈ پر رواں ہوئی جو قدمگاہ پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ تھوڑی دور چل کر ہم رُک گئے سیڑھیوں پر چڑھ کر ہم ایک بارہ دری سے گزرے یہاں دائیں طرف درجنوں قدیم طرز تعمیر کے کمرہ نما بالا خانے نظر آئے بعض کمروں میں لوگ بیٹھے ہوئے کھانا پکانے میں مصروف تھے میں نے فاضلی صاحب سے پوچھا کہ یہ کمرہ نما بالا خانے کس لیے بنائے گئے تو انہوں نے بتایا کہ زائرین یہاں آکر کئی کئی دن تک مقیم رہتے ہیں اس دوران وہ ان ہی جگہوں پر ٹھہرتے ہیں۔ آگے چل کر ہم چند سیڑھیوں پر مزید اوپر چڑھے ہمارے سامنے ایک بڑا قدیم طرز کا دروازہ تھا اس سے داخل ہوئے تو دور دور تک سبزہ زار اور پھولوں کی کیاریاں نظر آرہی تھیں۔ اسی احاطے کے بیچ میں سامنے وہ گنبد نما گول عمارت نظر آرہی تھی جس میں وہ پتھر محفوظ ہے۔ اس عمارت کے اندر چوطرفہ دروازے تھے۔ سامنے سے داخل ہو کر بائیں طرف ایک کونے میں سنہری جالی اور شیشے کے اندر وہ پتھر نصب تھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ امام رضا کے قدمین کے آثار ہیں جو دوران نماز اس مقام پر پتھر میں بن گئے تھے۔ زائرین کو اس پتھر کی زیارت کیلئے سر جھکا کر دیکھنا پڑتا ہے۔ غیر ارادی طور پر ہی میرا ذہن مسجد حرام کے مقام ابرھیم کی طرف گیا جہاں پتھر میں حضرت ابراھیم علیہ السلام کے اس قسم کے نقش قدم موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی ذہن نارسا نے

یہاں اس کی تشبیہ اور کاپی کی اختراع کی ہو یا حقیقت ہو واللہ اعلم عند اللہ۔ عورتیں بائیں طرف کے دروازے سے داخل ہو کر زیارت کر رہی تھی۔ ہم اس عمارت کے پچھلے دروازے سے باہر نکلے تو یہاں کچھ مرد پاکستانی لباس میں ملبوس اپنے فیملی کے ہمراہ بیٹھے تھے۔ مولانا سمیع الحق اور مولانا شیر علی شاہ صاحب نے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ تو انہوں نے بتایا کہ ہم لاہور سے آئے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہاں تک کس طرح پہنچے؟ تو نہوں نے کہ ہم لاہور سے تفتان (یعنی ایرانی بارڈر) تک اپنی گاڑیوں میں اور آگے یہاں تک اجرت کی گاڑیوں میں آئے۔ انکا کہنا تھا کہ ہم دو ماہ تک ایران میں مقدس مقامات کی زیارت کیلئے مقیم رہیں گے۔

قدمگاہ کے دروازے سے نکلتے ہوئے یہاں دائیں طرف ان تعمیرات کی تاریخ تعمیر وغیرہ کے احوال پر مبنی ایک دو فٹ چوڑا اور چار فٹ لمبا کتبہ دیوار پر نصب نظر آیا۔ لیٹ ہونے کی ڈر سے تفصیلاً پڑھنے کا موقع تو نہ مل سکا تاہم اتنا ضرور پڑھا کہ شاہ عباس نے اسے 1091ھ میں بنوایا تھا۔ اور بعد میں شاہ سلیمان نے اس میں بیش بہا اضافے کیے۔

قدمگاہ کے دروازے پر بعض دوکاندار پانی کے خالی گیلن بیچ رہے تھے میرے پوچھنے پر کہ اس کا یہاں کیا مصرف ہے بتایا گیا کہ زائرین یہاں سے پانی تبرک کے لئے لے جاتے ہیں۔ گویا جس طرح حجاج زمزم کے گیلن بھر کے لاتے ہیں اس طرح یہاں کے زائرین قدمگاہ کا پانی لے کر جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت سے نوازیں پتہ نہیں دین میں کتنی کتنی بدعات ورسومات، نفسانی خواہشات کی بنیاد پر شامل کی گئی ہیں۔ یہی بدعات آگے چل کر گمراہی کا سبب بنتے ہیں۔　　مسلمان ہے توحید میں گرم جوش　　مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

ان دوکانوں میں قدمین کے نقش بھی بک رہے تھے میں نے بھی ایک نقش خریدا۔ جس پر اوپر یہ عبارت سنہرے حروف سے لکھی گئی ہے "عن الرضا فی نیسابور قال اللہ تعلیٰ کلمۃ لاالہ الااللہ حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی بشروطھا وانا من شروطھا" ہمیں اس قول کی صحت وعدم صحت سے سروکار نہیں۔ علماء اہل سنت نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس نقش کے بیچ میں قدمین کے آثار ہیں۔ اور نیچے یہ عبارت ہے "اثر قدم منسوب الی الامام الرضاء علیہ السلام حال الصلوٰۃ فی ھذا المکان (قدمگاہ نیسابور)" اب ہماری گاڑی سڑکوں کی پیچ وخم کاٹتی ہوئی نیشاپور کی طرف بڑھ رہی ہے۔

<u>نیشاپور:</u> نیشاپور کا نام تو بچپن میں کئی مرتبہ سنا تھا لیکن اس کی عظمت واہمیت کا احساس دورۂ حدیث میں امام مسلمؒ کے حالات اور اس کے مسکن کے اعتبار سے ہوا۔ آج ہمیں اللہ نے اپنی آنکھوں سے امام مسلمؒ کا دیس دیکھنے کا موقع عطا کیا

نیشاپور ایران کا پرانا تاریخی اور مردم خیز شہر ہے۔ کسی زمانے میں اسے ام البلاد کہا جاتا تھا دنیا کے دوسرے اہم تاریخی شہروں کی طرح یہ بھی کئی بار بسا اور کئی بار اجڑا ہے۔ کبھی یہاں چنگیزیوں نے خون کی ہولی کھیلی کبھی ترکمانوں نے قیامت مچائی۔ یاقوت نے لکھا ہے کہ جب غزان اس شہر میں داخل ہوا تو اسے جو کوئی ملا اس کو لوٹ کر مار ڈالا۔ اور آخر کار پورے شہر کو آگ لگا کر ختم کر دیا۔ 618ھ میں مغولوں نے اسے تاراج کیا۔ یاقوت جو مغولوں کا معاصر

تھا وہ کہتا ہے کہ خراسان پر مغولوں کے حملے کے دوران جو لوگ بھی بچ نکلے انہوں نے نیشاپور میں آکر سکونت اختیار کی۔ آخر مغولوں نے پھر اس شہر کا بھی محاصرہ کر دیا اس موقعے پر نیشاپور کے ایک رہائشی نے چنگیز خان کے داماد کو نشانہ لے کر تیر سے مار ڈالا۔ داماد کے انتقام کے جوش میں چنگیز مقابلے کے لئے خود یہاں پہنچے اور ہر زندہ آدمی کو مار ڈالا۔ حتی کہ پورے شہر کو مٹی مٹی کر دیا۔ چنگیز کی تباہی کے بعد یہ شہر دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام نہ پا سکا۔

نیشاپور کا شمار خراسان کے چار قدیم بڑے شہروں (مروا، بلخ، ہرات، نیشاپور) میں ہوتا ہے۔ مسلمان اس شہر میں حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں صلح کے ساتھ داخل ہوئے۔ یہی وہ شہر ہے جو عطار کا مقتل اور امام مسلم کا مسکن اور خیام کا مدفن تھا یہی وہ شہر ہے جو سلجوقی سلطان طغرل بیگ کا پہلا دارالسلطنت تھا اور اسی میں سب سے پہلا مدرسہ بیہقیہ تعمیر ہوا۔ اگرچہ عام شہرت مدرسہ نظامیہ بغداد کے اولین ہونے کی ہے جیسا کہ ابن خلکان نے بھی دعویٰ کیا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ فخر بغداد کے بجائے نیشاپور کو حاصل ہے بغداد کا نظامیہ ابھی وجود میں نہیں آیا تھا کہ نیشاپور میں متعدد دارالعلوم قائم ہو چکے تھے۔ ایک یہی بیہقیہ، دوسرا سعدیہ، تیسرا النصریہ جس کو سلطان محمود کے بھائی نصر بن سبکتگین نے قائم کیا تھا اور چوتھا نظامیہ، دنیا کی عظیم ترین رصدگاہ بھی سب سے پہلے یہیں تعمیر ہوئی۔ عصر کے وقت سوا پانچ بجے ہم نیشاپور پہنچے۔ نیشاپور سرسبز وشاداب علاقہ پر مشتمل ہے۔ اس کی سڑکیں بھی ایران کی دیگر شہروں کی طرح کھلی اور صاف ستھری تھیں۔ موجودہ نیشاپور کی آبادی فرہنگ جغرافیہ ایران جلد ۹ کے اعتبار سے **24270** افراد پر مشتمل ہے۔

مقبرہ عمر وخیامؒ: **5:20** پر ہم یہاں پہنچے۔ بظاہر باہر سے یہ ایک وسیع سرسبز وشاداب پارک نظر آرہا تھا تاہم باہر ایک کتبے مقبرہ عمر وخیام لکھا ہوا نظر آیا۔ یہاں داخلے پر ٹکٹ لیا جاتا ہے۔ ہمارے میزبان نے تمام ساتھیوں کیلئے انٹری ٹکٹ لے لیے پارک میں لوگ سیر وتفریح کیلئے آئے ہوئے تھے۔ بعض لوگ سبزہ زار میں چہل قدمی کر رہے تھے اور بعض مختلف بنچوں پر محو گفتگو نظر آئے۔

پارک میں داخل ہونے پر بائیں جانب ایک مجسمہ نصب تھا جس کے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ یہ عمر وخیام کا ہے یہاں لان میں ایک بڑا حوض بھی بنا ہوا تھا۔ پارک میں گیٹ سے لے کر مقبرہ عمر وخیام تک پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی سڑک تعمیر کی گئی ہے۔

عمر وخیام کا مقبرہ آٹھ سہ گوشہ ستونوں پر بلند گنبد نما شکل کا ہے ہر ستون پر گلکاری کی گئی ہے۔ بقول ایک ساتھی کے معلوم ہوتا ہے کہ رباعیات خیام کا کوئی دل کش اور حسین نقش مجسم ہو کر مقبرہ خیام کی صورت اختیار کر گیا ہے مقبرہ ایران کے جدید فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ لوح مرقد پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

کل شئی ھالک الا وجھہ، حکیم ابوالفتح بن ابراھم خیام نیشاپوری، کہ پس از ہفتاد و چند سال زندگانی در سال ۵۱۷ھ برحمت ایزدی پیوست، یہ مقبرہ انجمن اثار ملی نے محمد رضا شاہ پہلوی کے فرمائش پر ۱۳۸۱ھ میں مکمل کیا۔

شاعری، مہندسی، منجمی اور حکمت وہ میادین ہیں جس میں عمر وخیام یدطولیٰ کے مالک تھے۔ خیام سلطان جلال

الدین ملک شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوئے آپ نے دنیا علم وفضل اور شعروسخن میں بڑا نام پیدا کیا۔ تقویم جمالی اور نوروز نامہ اس کے عظیم مہندس ہونے کے بین ثبوت ہیں۔ ریاضی میں یگانہ روزگار تھے۔ جبر ومقابلہ میں اس کے مرتب کردہ مسائل اب بھی برٹش میوزیم میں رکھے ہیں۔

خیام نے نیشاپور میں لوگوں سے کنارہ کش ہوکر گوشہ نشینی اختیار کی۔ یہاں تک کہ اس پر بداخلاقی، تنگ نظری اور کم آمیزی کی تہمت لگائی گئی۔ خیام کے بارے میں بہت سے بے سروپا قصے مشہور ہیں۔ معلوم نہیں اس کی صحت کس حد تک ہے۔ خیام کے عقیدہ تناسخ سے متعلق ایک حکایت یوں بیان کی گئی ہے کہ ایک خستہ حالت مدرسے کی تعمیر ومرمت کا کام ہورہا تھا اس کے لئے اینٹیں گدھوں پر لائی جارہی تھیں ایک دن خیام چند شاگردوں کے ساتھ ادھر سے گزرا۔ اس نے دیکھا کہ ایک گدھا خرکار کی پوری کوشش اور مارنے پیٹنے کے باوجود مدرسے کے اندر قدم نہیں رکھتا۔ یہ دیکھ کر خیام اس گدھے کے پاس گیا اور اس کے کان میں کہا:

ای رفتہ وباز آمدہ بلھم گشتہ　　نامت زمیان نام ھا گم گشتہ

ناخن ہمہ جمع آمدہ وسم گشتہ　　ریشت زقفا برآمدہ دم گشتہ

اے کہ تو مرگیا اور پھر چوپائے کے روپ میں واپس آ گیا ہے۔ تیرا نام بہت سے ناموں کے اندر گم ہوگیا ہے۔ تیرے ناخن جمع ہوکر سم بن گئے ہیں اور تیری ریش تیری پیٹھ سے نکل کر دم بن گئی ہے۔

یہ سنتے ہی گدھا فوراً مدرسے کے احاطہ میں داخل ہوگیا۔ شاگردوں نے خیام سے پوچھا کہ آپ نے گدھے کے کان میں کیا کہا کہ اس نے فوراً مدرسے میں قدم رکھ دیا۔ خیام نے جواب دیا کہ اس گدھے کی روح اس سے پہلے اس مدرسے کے ایک طالب علم کے وجود میں تھی۔ وہ اس لئے مدرسے میں داخل نہیں ہورہا تھا کہ مبادا اس کے ساتھی اس کو پہچان لیں۔ جب اس کو معلوم ہوگیا کہ میں نے اس کو پہچان لیا ہے اور اب اخفا لاحاصل ہے تو فوراً مدرسے کے اندر داخل ہوگیا۔ یہ ایک دلپذیر اور پرلطف قصہ ہے لیکن حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اس پر یہ الزام بھی ہے کہ تعلیم وتدریس میں تنگدل اور بخیل ہے۔ لیکن اگر زمانے نے اس کو آزادانہ درس وتدریس کی اجازت نہیں دی تو اس میں اس کا کیا قصور۔

ومن یك ذافمر مرّ مریض　　یجد مرّ به الماء الزلالا

کہتے ہیں کہ ایک فقیہ اس کے پاس علم وحکمت پڑھنے آیا کرتا تھا لیکن جب لوگوں میں جاتا تو اس کے خلاف زہر اگلتا۔ اور اس کی حکمت سے انکار کرتا۔ ایک دن خیام نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ اب اگر فقیہ اس کے گھر آئے تو نقارہ بجادیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جب نقارہ کی آواز سن کر لوگ اس کے گھر آئے تو خیام نے کہا کہ یہ فقیہ ہر روز چھپ کر میرے گھر آتا ہے اور مجھ سے علم وحکمت کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ لیکن جب عام لوگوں میں جاتا ہے تو مجھے برا بھلا کہتا ہے۔ اور مجھ پر کفر کی تہمت لگاتا ہے۔ اگر جو کچھ وہ میرے بارے میں کہتا ہے اس پر یقین رکھتا ہے تو میرے

گھر کیوں آتا ہے اور مجھ سے کیوں علم وحکمت کا درس لیتا ہے؟ علامہ قزوینی نے اس داستان کو آثار البلاد میں نقل کیا ہے۔اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ خیام اپنے شاگردوں کے ہاتھوں بھی ستم رسیدہ ہے۔اب اور لوگوں کا کیا کہنا؟

خیام کے زمانہ میں نیشاپور میں رافضیوں اور اشعریوں میں شدید قسم کا تعصب اور اختلاف تھا۔اشاعرہ نے ہر قسم کی آزادئ فکر کو کچل کر رکھ دیا تھا۔اس متعصب خشک ظاہری اور سخت گیر ماحول کی جھلک خواجہ نظام الدین کی تصنیف 'سیاست نامہ'' میں ملتی ہے۔عموماً لوگ خیام کو بہترین رباعی گو اور آزاد منش شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔خیام کے رباعیات کے تراجم دنیا کے کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

امام محروق زادہؒ: خیام کے مرقد پر فاتحہ پڑھ کر ہم دائیں طرف سبزہ زار میں تیس چالیس گز آگے چل کر سیڑھیوں سے اوپر چڑھے سامنے ایک گنبد نما نیلے ٹائلوں سے سجائی ہوئی عمارت نظر آرہی تھی یہاں امام محمد محروق ابن محمد ابن زید ابن علی ابن حسین ابن علی کی قبر ہے۔اس عمارت پر بہترین نقاشی کی گئی تھی۔باہر کی طرف محرابوں پر اور دیواروں کے حاشیوں پر قل یٰعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا انہ ھو الغفور الرحیم اور آیت الکرسی بہترین رسم الخط سے لکھی گئی تھی۔ایرانی طرز تعمیر کا یہ بہترین فن پارہ تھا۔قبر پر ہم سب ساتھیوں نے فاتحہ خوانی کی ۔واپس نکل کر ہم مین گیٹ سے نکلے۔گیٹ کے قریب اور گیٹ سے باہر درجنوں دوکانیں آباد تھیں جس میں زیادہ تر فیروزہ زمرد اور یاقوت کے پتھر کی دوکانیں تھیں۔لوگ بڑے شوق سے یہاں سے خریداری کر رہے تھے۔

شیخ فریدالدین عطارؒ اور کمال الملک: اب ہمارا مطمع نظر شیخ عطارؒ کا مرقد تھا۔گاڑیوں میں سوار ہو کر ہم سیدھے روڈ پر روانہ ہوئے روڈ کے دونوں کناروں پر قطار در قطار سرسبز وتناور درخت دلکشی کا سبب بن رہے تھے۔راستے میں سڑک پر مختلف سائن بورڈوں پر یہ جملے نمایاں نظر آرہے تھے اللہ اکبر، الحمدللہ، سبحان اللہ، نماز چہرہ شیطان را سیاہ می گردانید، حجاب برائے زناں مثل صدف درمرواریداست۔یہ ہمارے لیے قابل تقلید چیزیں ہیں۔ہمارے ملکوں میں تو سائن بورڈز کا استعمال صرف اپنے مصنوعات کی تشہیر یا فلمی ایکٹروں اور کھلاڑیوں کی تصاویر یا اپنے اپنے حق میں نعرہ بازیوں کے لئے ہوتا ہے۔ایک دوسری نمایاں خصوصیت ایران کی یہ معلوم ہوئی کہ یہاں سب کچھ فارسی زبان میں لکھا نظر آتا ہے۔گویا ایرانی قوم مغرب سے اس سلسلے میں قطعاً مرعوب نہیں کہ ہر جگہ انگریزی کو ٹھونسا جائے۔چند ہی لمحوں میں ہم شیخ عطار سے منسوب پارک کے دروازے پر پہنچ گئے۔یہاں بھی داخلے پر ٹکٹ لینا پڑتا ہے مجھے ایسا لگا کہ جہاں جہاں اہل سنت کے اکابر محو خواب ہیں وہاں پر انٹری ٹکٹ لازمی قرار دی گئی ہے اور جہاں اہل تشیع کے اکابر ہیں وہاں پر کوئی انٹری ٹکٹ نہیں۔اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ایران میں قدمگاہ کے داخلے، امام رضاء کی زیارت گاہ میں داخلے، اور اسی طرح امام محروق زادہ کے مزار پر داخلے کے وقت ہم سے کسی قسم کے ٹکٹ کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔اور اب عطارؒ کا مزار خیامؒ کے بعد دوسرا مقام تھا جہاں ہم سے داخلے پر ٹکٹ لیا گیا۔ممکن ہے کہ اہل ایران

نے تاریخی ورثہ کے اعتبار سے ان مقامات پر انٹری ٹکٹ لگایا ہو۔

پارک میں ہم پونے پانچ بجے داخل ہوئے سامنے قدیم مشرقی طرز تعمیر کا گنبد نما ساقبہ نظر آرہا تھا۔ ہم اس کی طرف بڑھ رہے تھے شیخ عطار کے روضے سے پہلے بائیں جانب ایک چھوٹا سے جدید طرز تعمیر کا حامل انتہائی خوبصورت مقبرہ نظر آیا قریب جا کر دیکھا تو یہ ایران کے مشہور نقاش کمال الملک محمد غفاری کا تھا۔ قبر کے سرہانے کمال الملک کا مجسمہ بھی نسب تھا۔ قبر کے قریب یہ الفاظ لکھے تھے ''بفرمان شہنشاہ ایران اعلیٰ حضرت محمد رضا شاہ پہلوی ساختمان آرام گاہ استاد ہنر مند عالی قدر شاہ رواں محمد غفاری کمال الملک فرزند شاہ رواں مرزا غفاری از طرف انجمن آثار ملی''

اب ہم ایک عظیم بزرگ ہستی کے مرقد کی طرف ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے جارہے تھے۔ ایک عجیب رعب اور جلال کا عالم تھا۔ سادگی اور وقار نمایاں تھی۔ مزار کے احاطے میں داخل ہو کر ایک قالین پر ہم بیٹھ گئے۔ اس عظیم ہستی کے کچھ احوال پیش ہیں۔

لقب فرید الدین کنیت ابو حامد اور پورا نام محمد بن ابی بکر ابراھیم بن اسحٰق عطار نیشاپوری ۵۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد عطر فروش تھے والد کی طرح اس کا پیشہ بھی یہی تھا۔ بچپن سے لیکر جوانی تک حصول علم میں مصروف رہے۔ اسکے ساتھ مطب میں بیٹھ کر طبابت بھی کرتے تھے۔ آسودہ حال تھے اسلئے دیگر شعراء کی طرح شاعری کو ذریعہ معاش بنانے پر مجبور نہ ہونا پڑا۔ عطار کو بچپن سے درویشوں کیساتھ خاص لگاؤ اور عقیدت رہا۔ تاہم آپ کے بارے میں یہ حکایت زبان زد خاص وعام ہے جسے مولانا شیر علی شاہ مدظلہ نے ان کے مرقد پر بھی سنایا کہ مال و دولت کو ترک کر کے سیر وسلوک کی وادی میں قدم رکھنے سے قبل ایک بار عطار اپنی دوکان پر بیٹھا تھا کہ ایک فقیر نے جس کا لباس نہایت بوسیدہ تھا اسکے پاس آکر سوال کیا۔ عطار نے اسے کچھ نہیں دیا۔ فقیر نے اس سے پوچھا کہ تو عزرائیل کو اپنی جان کیسے دیگا۔ عطار نے تیکھے انداز میں اس فقیر سے پوچھا کہ تو اپنی جان کیسے دیگا؟ فقیر نے یہ سن کر اپنے کشکول کو سر کے نیچے رکھا، پاؤں قبلے کی طرف پھیلائے اور آنکھیں بند کر کے کہا یوں اور وہی پر جان دے دی۔ اس واقعہ نے عطار کے اندر انقلاب پیدا کر دیا چنانچہ وہ اپنے تمام مال ومتاع کو غریبوں میں تقسیم کر کے خانقاہ رکن الدین اکاف میں گوشہ نشین ہو گیا

یہ تو آغاز ہوا، انجام کے بارے میں بھی ایک روایت میں کہا جاتا ہے کہ ایک منگول نے نیشاپور میں قتل عام کے دوران ضعیف العمر عطار کو قیدی بنالیا اور اسے لے کر اپنے آگے آگے دوڑاتا ہوا چلا۔ راستے میں شیخ عطار کے کسی مرید نے اسے اس حال میں دیکھ کر پہچان لیا۔ اس نے منگول سے درخواست کی کہ شیخ کو کچھ چاندی لے کر رہا کر دے لیکن شیخ نے منگول کو مخاطب کر کے کہا کہ میری اتنی قیمت نہیں ہے۔ چنانچہ منگول نے مرید کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور شیخ کو اسی حال میں لئے آگے روانہ ہوا۔ وہ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ شیخ کے ایک دوست نے اسے پہچان لیا اور منگول سے درخواست کی کہ کچھ زر وطلا لے کر شیخ کو آزاد کر دے شیخ نے پھر منگول کو مخاطب کر کے کہا کہ میری قیمت یہ نہیں ہے منگول نے یہ سوچ کر کہ شیخ کی رہائی کے بدلے اس سے زیادہ قیمت مل سکتی ہے اس کی پیشکش بھی ٹھکرا دی اور آگے بڑھ گیا۔

راستے میں ایک دیہاتی ملا جو اپنے گدھے کو لئے جارہا تھا اس نے شیخ کو پہچان کر منگول سے درخواست کی کہ وہ اسے رہا کردے منگول نے دریافت کیا کہ وہ اسکے بدلے میں کیا دے گا؟ دیہاتی نے جواب دیا: ایک تو بڑھ گھاس۔ شیخ نے یہ سن کر منگول کی طرف دیکھا اور کہا ٹھیک ہے یہی میری قیمت ہے۔ منگول یہ سن کر سخت برہم ہوا اور تلوار نکال کر شیخ کا سر قلم کردیا۔ شیخ نے جھک کر اپنا کٹا ہوا سر زمین پر سے اٹھالیا اور دوبارہ اپنی گردن پر رکھ لیا اور بے اختیار اس کے لبوں پر ایک مختصر نظم ''بے سرنامہ'' کے اشعار جاری ہوگئے۔ اسی حالت میں وہ حیرت زدہ منگول کے آگے آگے چلتا بھی رہا۔ نظم کے ختم ہوتے ہی وہ گرا اور اس کی روح پرواز کرگئی۔

عطار نے اپنی عمر کا ایک حصہ دیگر سالکین طریقت کی طرح سفر میں گزارا۔ مکہ معظمہ سے لے کر ماوراء النہر تک بیشمار مشائخ کی زیارتیں کیں انہی اسفار اور ملاقاتوں میں مجد الدین بغدادی تک پہنچے جن سے طریقت کا سلسلہ باندھا۔

تذکرۃ الاولیاء، منطق الطیر، اسرارنامہ، الٰہی نامہ، مصیبت نامہ اور اشترنامہ آپ کی یادگار تالیفات ہیں۔

مولانا روم جیسی ہستی کامل بھی عطار کو شاگردانہ خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔

عطار روئے بود و سنائی دو چشم او — ما در پئے سنائی و عطار آمدیم

من آں مولای روم ام کہ از نظم بشکر ریزد — ولیکن در سخن گفتن غلام شیخ عطارم

انچہ گفتم از حقیقت اے عزیز — ان شنید ستم ہم ز عطار نیز

مولانا سمیع الحق صاحب نے عطار کے مزار پر رومی کا یہ شعر خوش الحانی سے پڑھا۔

ہفت شہر عشق را عطار گشت — ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

عطار کا مرقد زمین سے ڈیڑھ فٹ اونچا ہے۔ جس پر کالے رنگ کی سنگ مرمر لگایا گیا تھا۔ عطار کے قبر کے سنگ مرمر پر یہ الفاظ سات ستروں میں لکھے ہوئے تھے:

آرام گاہ عارف ربانی سخن سرای نامی، فرید الدین عطار، ہر کہ او رفت از میاں اینک فتا — چون فنا گشت از فنا اینک

سال ولادت پانصد و چہل قمری تاریخ وفات شنبہ ۱۵ صفر شش صد و پنجدہ قمری

وما احد یخلد فی البرایا — بل الدنیا تؤول الی زوال

قبر کے سرہانے کالے پتھر کی چھ فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی ایک تختی لگی ہے جس پر شاید عطار کے مدح کے اشعار کندہ ہیں۔ باوجود کوشش کے پڑھا نہ جاسکا۔ یہاں ہم نے فاتحہ پڑھی اور تصوف و روحانیت کے ایک عظیم امام کے مرقد کے سرہانے جانب مغرب دروازے میں کھڑے ہوکر مولانا سمیع الحق صاحب نے عصر کی نماز 6 بجے پڑھائی۔ قبر کے اس احاطے میں باجماعت نماز میں عجیب روحانی لطف محسوس کیا۔ نماز کے بعد قبر کے آس پاس بیٹھ کر مولانا سمیع الحق اور مولانا شیر علی شاہ کے علم و عرفان شعر و شاعری، ادب اور تصوف کے علم افروز باتوں سے ہم سب محظوظ ہوتے رہے۔

(جاری ہے)